Fikr-o-Nasar (Islamabad) 2:10 (1965)

تاریخ فکر اسلامی میں اقبال رح کا مقام

محمد سرور

اسلام بحیثیت دین کے کسی خاص نسل وطن اور علاقے سے مختص نہیں ہے ۔ اس کا انسان کا تصور تمام انسانوں پر ، جو سب کے سب حضرت آدم کی اولاد ہیں، حاوی ہے اور وہ ان میں کسی قسم کی مادی تمیز کا قائل نہیں۔ اس کے نزدیک ہدایت الہی کا سلسلہ شروع سے جاری ہے ۔ بعثت محمدی اس سلسلے کی آخری کڑی ہے ۔ اور قرآن مجید پہلی ہدایتوں کی تصدیق کرنے والا ہے ۔ غرض اسلام نے ایک جامع و ہمہ گیر ہدایت کا تصور پیش کیا۔ جس کی مخاطب ساری انسانیت تھی ۔ چنانچہ جہاں وہ کل زمانوں کے لئے تھا وہاں وہ سب انسانوں کے لئے بھی تھا ۔ اس کی یہی عمومیت اور عالمگیریت اسے تمام دوسرے مذاہب سے ممتاز کرتی ہے۔

اسلام کی یہی وہ روح تھی جو عالمی، انسانیت گیر، وسعت پذیر اور متحرک اسلامی تہذیب کو وجود میں لانے کا باعث بنی ۔ مسلمانوں نے نہ صرف ”الکتاب“۔ ”الحکمہ“ اور طرق ”تزکیہ“ کو جن کی تبلیغ و تلقین کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تھے اپنا موضوع بحث بنایا اور ان کے بارے میں مستقل علوم و فنون ایجاد کئے ۔ بلکہ بتدریج انھوں نے ان تمام علوم و معارف پر جو ان سے پہلی قوموں کی کوششوں سے وجود میں آئے تھے عبور حاصل کیا ۔ ان کو چھانا پھٹکا اور انہیں اپنایا ۔ اسی طرح مسلمانوں نے پہلی تہذیبوں کا بھی جائزہ لیا ۔ اور ان میں جو چیزیں اچھی تھیں ان کو کھلے دل سے اختیار کیا اور انہیں اسلامیت کے رنگ میں رنگ لیا۔ مسلمانوں کا یہ عروج و اقبال کا دور تھا۔ اور اس میں اسلامی تہذیب ”خذ ما صفا و دع

ما کدر'' کے زندگی بخش اصول پر عمل کرتی ہوئی بڑی قوت کے ساتھ آگے بڑھتی گئی ۔

قوموں کو یک بارگی زوال نہیں آیا کرتا ۔ زوال کے جراثیم اندر ہی اندر آہستہ آہستہ ان کی معنوی قوتوں کو کھوکھلا کرتے رہتے ہیں ۔ پھر ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ ان قوموں پر کوئی بڑی مادی افتاد پڑتی ہے' جس سے ان کے جسمانی قویٰ ضعیف ہوجاتے ہیں ۔ آخر میں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زوال کے جراثیم کا ان پر غلبہ ہوجاتا ہے اور انہیں زوال پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے ۔

گیارھویں صدی عیسوی کے بعد دو سو سال تک مسلسل یورپ کے صلیبی حملے اور اس کے بعد تیرھویں صدی میں تاتاریوں کا سیلاب ۔ یہ دو بڑی مادی افتادیں تھیں جنھوں نے اسلامی تہذیب کی معنوی قوتوں کو اتنا کمزور کردیا کہ اس کے بعد وہ بتدریج سمٹتی اور جامد اور بے جان ہوتی چلی گئی ۔ اور بجائے اس کے کہ وہ پہلے کی طرح دوسروں کو اپنے دائرہ اثر میں لیتی خود اس کا اپنا دائرہ‌اثر برابر تنگ ہوتا گیا۔ اور اقدام و توسیع کی جگہ تقلید و جمود اس کا شعار بن گیا ۔

۱۰۹۷ء میں ایشیائے کوچک، شام و فلسطین اور مصر پر صلیبی حملوں کا آغاز ہوا ۔ اور تقریباً دو سو سال تک صلیبی حملہ آوروں کے ہاتھوں یہ علاقے تباہ ہوتے رہے ۔ ان حملوں کی وجہ سے نہ صرف یہ علاقے جو اس زمانے میں بڑے آباد تھے' ویران ہوگئے اور ان کے لکھوکھا باشندے تہ تیغ ہوئے بلکہ ان علاقوں میں جو بے شمار کتب خانے تھے وہ بھی جلادئے گئے اور اس طرح گذشتہ چار پانچ سو سال میں ان اطراف میں علم و ادب نے جو ترقی کی تھی' وہ سب ان غارتگریوں کی نظر ہوگئی ۔

۱۲۱۸ء میں چنگیز خان نے وسط ایشیا کے اسلامی ممالک کو بالکل تباہ و برباد کردیا ۔ ۱۲۵۸ء میں ہلاکو خان نے بغداد کو فتح کیا ۔ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ اس وقت بغداد کی آبادی بیس لاکھ تھی جس میں

سے صرف چار لاکھ زندہ بچے - اس کی وجہ سے تہذیب و تمدن اور علم و فنون کا جو نقصان ہوا وہ بے حد و حساب تھا -

سید امیر علی کے الفاظ میں '' پانچ صدیوں کی جمع شدہ علمی متاع ہمیشہ کے لئے نابود ہوگئی اور وہ طبقے جو قوم کا نچوڑ تھے مٹ گئے ''۔

اسلامی تہذیب کے وہ ذخیرے جو صدیوں کی محنت کا حاصل تھے' یوں ختم ہوئے اور وہ دانشور طبقے جو علمی و فنی روایات کے خالق و حامل ہوتے ہیں اور جن سے کہ تہذیب کا سلسلہ آگے چلتا ہے، ان کا اس طرح خون بہا - اس کے بعد ظاہر ہے اسلامی تہذیب کا نخل مرجھاتا نہ تو اور کیا ہوتا - سید امیر علی نے اس دور کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے -

'' جب ابن سینا کا ستارہ افق پر ظاہر ہوا تو اس زمانے کے حالات بڑے سازگار نظر آتے تھے - ابن سینا کے علم اجماع اور اس سے متعلقہ دوسرے علوم کے اعلیٰ تصورات کو اپنانے کے لئے .... لیکن عین اس وقت صلیبی حملوں نے مسلمانوں کی ساری توجہ موت و زندگی کی اس کشمکش میں اپنے آپ کو بچانے کی طرف مبذول کردی - اور ابھی اس سے انہیں نجات ملی ہی تھی کہ تاتاری سیلاب نے ان کو آلیا اور وہ اپنے ساتھ مشرق کا تمام تر کلچر اور تہذیب بہاکر لے گیا -''

ملت اسلامیہ کے زوال کے ان اندھیروں میں اصلاح کی ایک شمع ابھرتی ہے اور وہ ابن تیمیہ کی ذات گرامی تھی - امام صاحب کے مخاطب مختلف اسلامی فرقے تھے جو طرح طرح کی خرافات' سخت قسم کے جمود اور تقلید کا شکار تھے اور غلطی سے اس کو وہ اسلام سمجھے بیٹھے تھے - آپ نے کتاب و سنت کو اپنی اصلاحی دعوت کی اساس بنایا اور اس امر پر زور دیا کہ اسلام کے احیاء اور مسلمانوں کے زوال کو ختم کرنے کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ وہ کتاب و سنت کو مشعل راہ بنائیں - ڈاکٹر محمد البہی مدیر عام ثقافت اسلامیہ جامعہ ازہر لکھتے ہیں کہ اٹھارویں صدی میں محمد بن عبدالوہاب اور انیسویں صدی کے نصف اول میں محمد بن علی السنوسی کی اصلاحی تحریکیں امام ابن تیمیہ سے متاثر تھیں -

ان کے پیش نظر تمام تر مسلمانوں کے داخلی عیوب تھے جنہیں وہ اسلام کے نام سے اور اسلام کی اساس پر دور کرنے کی دعوت دیتے تھے۔ اہل یورپ کی زندگی میں نشاۃ ثانیہ کے بعد جو نظام بروئے کار آئے تھے ان سے یہ دونوں مصلح ناواقف تھے اس طرح وہ عالم اسلامی کے دوسرے حصوں میں بسنے والے مسلمانوں کی عام زندگی کا بھی تجربہ نہیں رکھتے تھے (۱)۔ اس ضمن میں شیخ محمد بن عبدالوہاب کے ہم عصر بر صغیر پاک و ہند کے عظیم مفکر و مصلح شاہ ولی اللہ صاحب کا بھی یہی حال تھا۔ وہ بھی اہل یورپ کے فکری و علمی انقلابوں سے ناواقف تھے اور ان کی فکری و دینی دعوت کے مخاطب تمام تر مسلمانوں کے مختلف فرقے تھے۔ ان کے بعد ان کے جو جانشین ہوئے انہوں نے بھی یورپ کے علوم و افکار سے دور رہنا مناسب سمجھا۔

عہد حاضر کے سید جمال الدین افغانی پہلے مصلح ہیں (۲) جن کی سرگرمیاں صرف ایک مخصوص مسلمان ملک تک محدود نہیں رہیں۔ وہ ہندوستان، مصر، حجاز، ایران، افغانستان اور ترکی میں رہے۔ پھر انہوں نے یورپ کو دیکھا اور اس کے مختلف شہروں میں زندگی کا ایک بڑا حصہ گذارا۔ یورپ کے سیاسی غلبے کے ساتھ اس کے علمی فنی اور ذہنی غلبے کا جتنا احساس سید جمال الدین افغانی کو تھا، ان سے پہلے جتنے بھی ہمارے مصلحین و مفکرین گذرے ہیں ان میں سے کسی کو نہیں تھا۔ اس احساس کا رد عمل یہ ہوا کہ انہوں نے یورپ کے اس سیاسی و ذہنی غلبے کے خلاف آواز اٹھائی اور

(۱) الفکر الاسلامی الحدیث و صلته بالاستعمار الغربی۔ اشاعت دوم۔ ص ۵۷

(۲) "یہ غالباً شاہ ولی اللہ دھلوی تھے، جنہوں نے سب سے پہلے ایک نئی روح کی بیداری محسوس کی، لیکن اس عظیم الشان فریضے کی حقیقی اہمیت اور وسعت کا پورا پورا اندازہ تھا تو سید جمال الدین افغانی کو، جو اسلام کی حیات ملی اور حیات ذہنی کی تاریخ میں بڑی گہری بصیرت کے ساتھ ساتھ طرح طرح کے انسانوں اور ان کی عادات و خصائل کا خوب خوب تجربہ رکھتے تھے، ان کا مطمح نظر بڑا وسیع تھا۔ اور اس لئے یہ کوئی مشکل بات نہیں تھی کہ ان کی ذات گرامی ماضی اور مستقبل کے درمیان ایک جیتا جاگتا رشتہ بن جاتی۔ ان کی ان تھک کوششیں اگر صرف اسی امر پر مرکوز رہتیں کہ اسلام نے نوع انسان کو جس طرح کے عمل اور ایمان کی تلقین کی ہے۔ اس کی نوعیت کیا ہے، تو آج ہم مسلمان اپنے پاؤں پر کہیں زیادہ مضبوطی کے ساتھ کھڑے ہوتے"۔
علامہ اقبال، تشکیل جدید الہیات اسلامیہ، مترجم سید نذیر نیازی ص ۱۲۵-۱۲۶۔

مسلمانوں کو اس کے خلاف علمی، عملی اور ذہنی طور پر منظم کرلے کی کوشش کی - اس سے پہلے ہمارے بزرگ نہ تو یورپ کے وجود کا اعتراف کرتے تھے اور نہ اس کے علوم و معارف اور عملی کارناموں کو درخور اعتنا سمجھتے تھے- ان کی اپنی دنیا تھی، جس کا دائرہ بہت محدود تھا - ڈاکٹر محمد البہی نے اپنی کتاب ''الفکر الاسلامی الحدیث'' میں شیخ محمد عبدالوہاب اور سید جمال الدین افغانی کی دعوتوں کا مقابلہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اول الذکر کے پیش نظر جو مثالی نمونے تھے، وہ ماضی کی تاریخ سے متعلق تھے اور ان کی دعوت بھی جدوجہد کی تھی لیکن اس کا زور ماضی پر تھا - اس کے مقابلہ میں سید جمال‌الدین افغانی اپنی دینی دعوت میں گو قرآن مجید ہی کو اساس بناتے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی ان کا یہ کہنا تھا کہ اسلام کے ماننے والوں کا فرض ہے کہ وہ قوی ہوں، عظمت و شوکت حاصل کریں - فوجی علوم میں کمال پیدا کریں جدید علوم پڑھیں، سائنس پر انہیں عبور ہو اور وہ اپنی عظمت رفتہ کو بحال کریں - (۳)

سید جمال‌الدین افغانی کے مخاطب مسلمان بحیثیت ایک عمومی وحدت کے تھے - ان کے مختلف فرقے نہ تھے - انہوں نے ان کو ایک ہولے کی دعوت دی‌اور فرقہ وارانہ نظریات کو وجہ اختلافات نہ بنانے پر زور دیا- سیدجمال‌الدین افغانی یورپ کے علوم و فنون ان کی تہذیب اور ان کے نظام ہائے حکومت کا بھی ذکر کرتے ہیں اور ان سے استفادہ کرنے کی دعوت دیتے ہیں لیکن اس شرط کے ساتھ کہ یہ اخذ و اختیار اسلام سے ہم آہنگ ہو (۴) - اور یہ کہ آج اسلام خود اس کا متقاضی ہے کہ ہم یہ سب کچھ کریں -

سید جمال الدین افغانی کی یہ دعوت کہ مسلمان بحیثیت مسلمان کے سیاسی لحاظ سے متحد ہوں - خود ان کے اندر جو فکری و علمی خرابیاں ہیں انہیں دور کریں اور یورپ نے زندگی کے مختلف شعبوں میں جو ترقی کی ہے اس سے وہ مستفید ہوں، اکثر اسلامی ملکوں میں بڑی مقبول ہوئی اوران میں مثال کے طور پر شیخ محمد عبدہ (مصر میں) اور اسماعیل بے گبر لسکی (۵) (روسی

---

(۳) ص ۵۷

(۴) الفکر الاسلامی الحدیث ص ۲۱

(۵) موصوف تاتاری تھے (۱۸۵۱-۱۹۱۴)- روسی ترکوں میں ایک طرف وہ ''پان اسلامزم'' تحریک کے بانی تھے جس کا سبق انہوں نے استنبول میں سید جمال‌الدین افغانی سے پڑھا اور دوسری طرف ان کی قلمی اصلاحی اور تعلیمی کوششوں سے روس میں آباد ترکوں کے ہاں ترکی قوم پرستی کی تحریک کا آغاز ہوا - وہ دنیائے اسلام کے اتحاد کے حامی تھے - انہوں نے روس کے تمام ترکوں کو جو مسلمان تھے، متحد کرنے کے لئے بھی عملی قدم اٹھائے - اسماعیل بے مسلمانوں کی سماجی زندگی میں بعض اصلاحات کے داعی تھے انہوں نے روسی ترکوں میں جدید طریقہ تعلیم کو جاری کیا، جس میں عربی ترکی کے ساتھ ساتھ نئے علوم بھی داخل تھے -

ترکوں میں) جیسے اہل فکر اور مصلحین پیدا ہوئے ۔ اس میں شک نہیں کہ شیخ محمد عبدہ بہت بڑے عالم دین تھے ، اور علوم دینیہ پر ان کی بڑی گہری اور وسیع نظر تھی اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ وہ یورپی زندگی سے خوب واقف تھے ۔ وہ یورپ میں رہ چکے تھے اور اکثر یورپ جایا کرتے تھے ۔ انہوں نے یورپی اہل قلم کے حملوں کے، جو وہ اسلام پر کرتے تھے بڑے اچھے جواب دئے اور مسلمانوں کی نوجوان نسلوں پر جو یورپی علوم سے متاثر ہو رہی تھیں دین اسلام کی حقانیت آشکارا کی، لیکن ڈاکٹر محمد البہی کے نزدیک شیخ محمد عبدہ صاحب فکر سے زیادہ ایک عملی مصلح تھے اور ان کی سرگرمیوں کا رخ فکر سے زیادہ عملی اصلاح کی طرف رہا ۔ اور اس کی وجہ ظاہر ہے ۔ شیخ محمد عبدہ کی یورپ کے علم و فنون اور بالخصوص ان کی تمام گہرائیوں اور وسعتوں تک رسائی نہیں ہوسکتی تھی ۔ مسلمانوں کے ہاں فکری ترقی رک جانے کے بعد تقریباً تین سو سال تک یورپ میں علم و فکر میں جو ترقی ہوئی اسے جانے بغیر یہ توقع رکھنا کہ آج اس دور میں عظیم فکر پیدا ہوسکتا ہے، صحیح نہیں ۔ خود اس برصغیر میں عہد حاضر میں جو مشہور اہل علم و فکر گذرے ہیں باوجود ان کی دوسری عظمتوں کے، وہ اس انسانی فکر سے جو گذشتہ تین صدیوں میں یورپ میں ارتقا پذیر رہا، زیادہ واقف نہ تھے ۔ اس کوتاہی کی وجہ سے ان کے افکار و خیالات میں وہ جدت اور زمانے کے ساتھ چلنے بلکہ اس کی رہنمائی کرنے کی وہ صلاحیت پیدا نہ ہوئی جس کی آج موجودہ نسلوں کو ضرورت ہے ۔ ڈاکٹر محمد البہی کے الفاظ میں "صرف اقبال ہی اسلام کی فکر دینی کی تجدید کے مسئلے میں ایک جامع شخصیت ہیں اور یہی چیز انہیں شیخ محمد عبدہ سے ممتاز کرتی ہے ۔ اقبال عصر حاضر میں اسلام کے صحیح معنوں میں "مصلح فکری ہیں" (٦)

تاتاریوں کے ہاتھوں بغداد کی تباہی کے بعد اسلام کے احیاء، اس کی فکر دینی کی تجدید اور اس کے نتیجے میں مسلمانوں کی اصلاح و ترقی اور انہیں معنوی و مادی طور پر مضبوط و طاقت ور بنانے کی جو بھی جدوجہد ہوتی رہی، اس

(٦) الفکر الاسلامی الحدیث صہ ۲۸۳

میں امام ابن تیمیہ، شاہ ولی اللہ رح، شیخ محمد بن عبدالوہاب، سید جمال الدین افغانی اور شیخ محمد عبدہ اور انہی جیسے دوسرے مصلحین کا اپنا اپنا مقام ہے اور ان میں کسی طرح کا فرق مراتب کرنا صحیح نہیں۔ ہر مصلح نے اپنے اپنے زمانے میں وہ کام کیا جس کی اس وقت شدید ضرورت تھی اور جس کے لئے اس کے حالات گرد و پیش سازگار تھے۔ علامہ اقبال اس سلسلہ کی ایک کڑی ہیں اور اس ضمن میں ان کا خصوصی امتیاز یہ ہے کہ کئی صدیوں تک مسلمانوں کے ہاں ذہنی حرکت رک جانے سے ایک بہت بڑا فکری خلا پیدا ہوگیا تھا، انہوں نے اسے بھرنے کی کوشش کی اور ایک لحاظ سے اسلامی فکر کو عہد حاضر کا ہم عنان کردیا۔ وہ اسلامی فکر اور جدید فکر دونوں پر حاوی تھے اور انہوں نے دونوں کو باہم مربوط کرنے کی سعی فرمائی۔

علامہ اقبال کو اسلام سے اذعانی اور شعوری طور پر غایت درجہ شیفتگی تھی اور اس شیفتگی کو وہ عشق کہتے ہیں۔ یہ عشق ان کی زندگی میں شروع سے آخر تک سب سے فعال اور موثر ترین محرک رہا ہے۔ اسلام سے انہیں یہ جو اذعانی شیفتگی تھی، ان کے علم و حکمت سے جو انہوں نے حاصل کیا، ان کے ہاں اس کی عقلاً بھی تصدیق ہوگئی اور اس طرح انہیں اسلام کی حقانیت کے کے بارے میں وہ حق الیقین حاصل ہوا جو ایک عظیم فکر کے لئے لازمی ہوتا ہے۔

بحیثیت ایک مفکر اسلام کے، علامہ اقبال رح کی ایک تو یہ خصوصیت ہے۔ دوسرے جہاں تک خود فکر اسلامی کو اس کے اصل مصادر سے اخذ کرنے کا تعلق ہے، علامہ اقبال اس کے پورے طور پر اہل تھے۔ ہوسکتا ہے کہ اسلامی علوم یعنی تفسیر، حدیث، فقہ اور علم کلام کی ساری جزئیات پر ان کی نظر نہ رہی ہو۔ لیکن جس حد تک ان علوم کے اصول و مبادی کا تعلق ہے مرحوم کو ان پر پورا عبور تھا اور انہیں بجا طور پر علوم اسلامیہ کا عارف کہا جاسکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ جہاں تک جدید علوم اور بالخصوص علوم فلسفیہ کا سوال ہے، علامہ اقبال کا ان میں وہی درجہ تھا جو یورپ کے کسی ممتاز اور نامور فلسفی کا ہوسکتا ہے۔ ان خصوصیات کے علاوہ ان کا عمر بھر

اپنے دور کے تاریخی محرکات اور عام انسانی اجتماع کی جدوجہد سے عملاً زیادہ نہ سہی لیکن ذہناً لابدی طور پر ربط رہا اور ان کے احساسات اس کے رد عمل سے برابر متاثر ہوتے رہے۔ علامہ اقبال نے اپنے خطبات و اشعار کے ذریعہ جو پیغام دیا ہے اس میں ان کی یہ تمام خصوصیات نمایاں نظر آتی ہیں ''جاوید نامہ'' میں وہ اپنی اس کوشش کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

من بطبع عصر خود گفتم دو حرف　　کردہ ایم بحرین را اندر دو ظرف
حرف پیچا پیچ و حرف نیش دار　　تا کنم عقل و دل مردان شکار
حرف تہ دارے با انداز فرنگ　　نالۂ مستانہ از تار چنگ
اصل این از ذکر و اصل آن ز فکر　　اے تو بادا وارث این فکر و ذکر
آب جویم از دو بحر اصل من است　　فصل من فصل است و هم وصل من است

تا مزاج عصر من دیگر فتاد
طبع من هنگامہ دیگر نہاد

مختصراً علامہ اقبال نے '' الٰہیات اسلامیہ '' کی تشکیل جدید کی - اپنی انقلاب آفرین شاعری سے ذہنوں کی یخ بستگی کو توڑا - دلوں کی مردنی کو ختم کیا اور انہیں نیا ولولہ حیات دیا ۔ اس بر صغیر کے مسلمانوں میں زندگی کی آج جو کچھ بھی آب و تاب نظر آتی ہے' اس میں بلا مبالغہ علامہ اقبال کا سب سے بڑا حصہ ہے - ان کی فکر حیات بخش اور ان کی شاعری ولولہ انگیز تھی اور ان دونوں سے انہوں نے وہ کام لیا کہ تاریخ اسلام میں اس کی بمشکل کوئی مثال ملے گی لیکن جیسا کہ انہوں نے اپنے خطبات کے دیباچہ میں فرمایا ہے۔

علامہ اقبال کی اردو و فارسی شاعری کی ہیئت' اسلوب بیان اور اس کا آہنگ وہی ہے' جو پہلے سے متعارف چلا آتا تھا - اور انہوں نے اپنے مطالب کے اظہار میں بھی انہیں استعاروں' تشبیہوں اور مثالوں سے کام لیا ہے جن سے ان کے مخاطب مانوس تھے - لیکن اس شاعری کی روح بالکل نئی ہے - اس میں تازگی ہے- زندگی کی بھرپور حرارت اور قوت ہے اور وہ صرف دلوں کو انہیں گرماتی

اور ان کو ایک نیا جذبہ اور امنگ عطا نہیں کرتی، بلکہ دماغ کو ایک فکری ارتعاش بخشتی ہے اور اس شاعری کو پڑھ کر اور اس کی اس روح کو اپنا کر آدمی وجدانی اور ذہنی دونوں اعتبار سے عصر حاضر کی فضا میں آجاتا ہے۔ علامہ اقبال نے بہت حد تک اپنی شاعری سے ہمارے اس ذہنی خلاء کو بھرا ہے۔ جس کا اوپر ذکر ہوا ہے۔ ظاہر ہے اس کے لئے انھوں نے وجدانی طریقہ اختیار کیا، جو زیادہ مؤثر، زیادہ دور رس اور زیادہ ہردلعزیز ہوتا ہے۔ یہ شاعری صرف وہی شخص کرسکتا تھا جو علم و ادب اور حکمت و فلسفہ ہر دو کا جامع ہوتا، قدیم کا بھی اور جدید کا بھی، اور اس کی ذات میں یہ سب تحلیل ہوکر اس طرح ایک ہوچکے ہوتے کہ ان میں قدیم و جدید کی کوئی تمیز نہ رہتی۔ اور وہ اس کی ذات کے جزو ترکیبی و ائتلافی بن چکے ہوتے۔ بحیثیت ایک شاعر کے، عہد حاضر میں مسلمانوں کے ہاں علامہ اقبال کی واحد شخصیت ہے، جسے یہ امتیاز حاصل ہوا۔ اسی لئے ان کی شاعری میں گہرائی، وسعت، زور اور فکر کی اس قدر فراوانی ہے اور اس کا اتنا زیادہ اثر بھی ہے۔ غرض قدیم اور جدید کی یہی جامعیت تھی جس نے علامہ اقبال کو ایک نئی معنویت عطا کی، حرکت، قوت اور عمل سے معمور معنویت، جس نے دلوں اور ذہنوں کو اس قابل بنادیا کہ وہ موجودہ دور کے تقاضوں کے اثرات کو قبول کرسکیں۔ برصغیر کے مسلمانوں کو عہد قدیم کی فرسودگی سے نکال کر دور حاضر کی تازگی سے آشنا کرنے میں علامہ اقبال کی شاعری کا بہت بڑا حصہ ہے اور اس کی وجہ سے وہ راہ ہموار ہو چکی ہے، جس پر ہمارا کارواں بڑی سرعت سے آگے جادہ پیما ہوسکتا ہے یہ شعری پیرائے میں دراصل فکر کی دعوت ہے، اسلامی فکر کی، جو ماضی کی تمام باقیات صالحات کو ساتھ لے کر مستقبل کی طرف رواں دواں ہے۔

علامہ اقبال نے "الہیات اسلامیہ" کی "تشکیل جدید" کے موضوع پر انگریزی زبان میں جو خطبات دیئے تھے، ان میں ایک جگہ آپ فرماتے ہیں:۔

> پچھلے پانچ سو برس سے الہیات اسلامیہ پر جمود کی ایک کیفیت طاری ہے، وہ دن گئے جب یورپ کے افکار دنیائے اسلام سے متاثر ہوا کرتے تھے۔ تاریخ حاضر کا سب سے زیادہ توجہ طلب مظہر یہ ہے کہ

ذہنی اعتبار سے عالم اسلام نہایت تیزی کے ساتھ مغرب کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس تحریک میں بجائے خود کوئی خرابی نہیں۔ کیونکہ جہاں تک علم و حکمت کا تعلق ہے مغربی تہذیب دراصل اسلامی تہذیب ہی کے بعض پہلوؤں کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ لیکن اندیشہ ہے کہ اس تہذیب کی ظاہری آب و تاب کہیں اس تحریک میں حارج نہ ہوجائے اور ہم اس کے حقیقی جوہر ضمیر اور باطن تک پہنچنے سے قاصر رہیں (۷)

اور اس اندیشے کی وجہ یہ ہے، جیسا کہ خود وہ فرماتے ہیں :-

" پچھلی متعدد صدیوں میں جب عالم اسلام پر ذہنی غفلت اور بے ہوشی کی نیند طاری تھی، یورپ نے ان مسائل میں نہایت گہرے غور و فکر سے کام لیا، جن سے کبھی مسلمان فلسفیوں اور سائنس دانوں کو دلی شغف رہا ہے۔ قرون وسطیٰ سے لیکر اب تک جب اسلامی مذاہب الہیات کی تکمیل ہوئی۔ انسانی فکر اور تجربے کی دنیا میں غیر معمولی وسعت پیدا ہوچکی ہے۔ فطرت کی تسخیر اور اس پر غلبے نے انسان کے اندر ایک تازہ یقین اور ان قوتوں پر جن سے اس کے ماحول نے ترکیب پائی، فضیلت کا ایک نیا احساس پیدا کردیا ہے، نئے نئے نقطہ ہائے نظر ہمارے سامنے آرہے ہیں (۸) "۔ اب ایک طرف پچھلی صدیوں میں یورپ علم، سائنس اور فلسفہ میں اتنی ترقی کر گیا۔ اور اس دوران میں عالم اسلام کی ذہنی ترقی رک گئی۔ اور دوسری طرف ان دنوں عالم اسلام " نہایت تیزی کے ساتھ مغرب کی طرف بڑھ رہا ہے " اس لئے علامہ مرحوم کے الفاظ میں

" ...... مسلمانوں کی اس تازہ بیداری کے ساتھ اس امر کی آزادانہ تحقیق نہایت ضروری ہے کہ مغربی فلسفہ ہے کیا۔ علیٰ ہذا یہ کہ الہیات اسلامیہ کی نظرثانی بلکہ ممکن ہو، تو تشکیل جدید میں ان نتائج سے کہاں تک مدد مل سکتی ہے، جو اس سے مترتب

(۷) ۔ (۸) تشکیل جدید الہیات اسلامیہ ص ۱۱ — ۱۲

هو ...... لہذا وقت ہے کہ ہم اسلام کے بنیادی اصولوں کا جائزہ لیں'' ۔

علامہ اقبال نے اپنے انگریزی خطبات میں اسی ضرورت کو پورا کرنے کی سعی بلیغ فرمائی ہے، انہوں نے جہاں اسلام کے بنیادی اصولوں کا جائزہ لیا ۔ اور اس ضمن میں قرون وسطی میں مسلمان فلسفیوں اور سائنس دانوں نے ان اصولوں کی جو تشریحات کی تھیں، ان پر بحث کی ۔ اور ان کے صواب و ناصواب کو پرکھا ۔ وہاں ان مسائل میں یورپ کے فلسفیوں اور سائنس دانوں نے جو فکری کاوشیں کی ہیں، ان پر محاکمہ کیا اور اس طرح اسلام کے بعض اساسی افکار پر جدید ترین فلسفیانہ نقطۂ نظر سے بحث کی ۔ اور مسلمانوں کی الہیاتی فکر کو قرون وسطی کے جمود و خمود سے نکال کر اسے عہد جدید کے متحرک فعال اور خلاق ذہن سے متعارف کرایا ۔

مرحوم نے اپنے چھٹے خطبے میں جس کا عنوان '' الاجتہاد فی الاسلام '' ہے، یہ ثابت کرنے کے بعد کہ یہ کہنا کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہوچکا ہے، محض ایک افسانہ ہے جس کا خیال کچھ تو اس لئے پیدا ہوا کہ اسلامی افکار فقہ ایک معین صورت اختیار کرتے چلے گئے اور کچھ اس ذہنی تساہل کے باعث کہ روحانی زوال کی حالت میں لوگ اپنے اکابر مفکرین کو بتوں کی طرح پوجنا شروع کردیتے ہیں ۔ لہذا اگر فقہائے متاخرین میں سے بھی بعض نے اس افسانے کی حمایت کی ہے تو کیا مضائقہ ہے ۔ اس امر کی بھی صراحت فرمادی ہے کہ '' عہد حاضر کے مسلمان کبھی یہ گوارا نہیں کریں گے کہ اپنی آزادی ذہن کو خود اپنے ہاتھوں قربان کردیں '' ۔ چنانچہ ان کے ارشاد کے مطابق آج ہمیں ضرورت اپنی حیات اجتماعیہ کی اسلام کے بنیادی اصولوں کی رہنمائی میں از سر نو تشکیل کی ہے ۔ اور واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے ہمیں ذہنی و وجدانی ہر دو لحاظ سے اس تشکیل کے عظیم کام کو سرانجام دینے کا راستہ بھی دکھایا ہے ۔ اور اس راستے پر ڈال بھی دیا ہے، جو ہمیں اس منزل پر لے جاسکتا ہے ۔